مسلمانوں کا رویہ کیا ہو؟

آیدین نورحان

[ترکی کے ایشیائی سنٹر برائے تزویری مطالعہ (TASAM) کے زیر اہتمام او آئی سی (اسلامی ممالک کی تنظیم) کے ممبر ممالک کا چھٹا تھنک ٹینک فورم ۷ اور ۸ مارچ ۲۰۱۵ء کو اسلام آباد میں ہوا۔ اس کا عنوان تھا: ''اسلامی ممالک میں کثیر جہتی سکیورٹی کا قیام''۔ اس موقع پر افغانستان میں او آئی سی کے مستقل مندوب جناب آیدین نورحان نے بھی خطاب کیا۔ اہلِ مغرب اور اہلِ اسلام کا باہمی تعلق ان کی گفتگو کا اہم نکتہ تھا۔ یہاں اس خطاب کا ترجمہ ضروری ادارت کے ساتھ دیا جا رہا ہے۔ یہ ان کے ذاتی خیالات ہیں ضروری نہیں کہ او آئی سی کا نقطۂ نظر بھی یہی ہو۔]

مسلم دنیا کے معزز تزویر کاران،

خواتین و حضرات،

ہمارے محبوب اور برادر ملک پاکستان میں مجھ ایسے فرومایہ کو اس معزز مجلس میں کلیدی مقرر بنا کر عزت افزائی کی گئی ہے۔

میں اپنے میزبان پاکستان کی سینیٹ کمیٹی برائے دفاع کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور اس کے ساتھ ساتھ اس پروگرام کے انعقاد میں معاون TASAM (ترکی کا ایشائی سنٹر برائے تزویری مطالعہ) کا بھی ممنون ہوں، جنھوں نے اس مجلس کا بروقت انعقاد ممکن بنایا۔ مجھے امید ہے کہ او آئی سی کے رکن

ممالک کے ساتھ عالمی سماج بھی اس مجلس کے انعقاد سے فائدہ اٹھائے گا۔

خواتین وحضرات!

آج دنیا بھر میں مسلمان حالت دفاع میں ہیں۔

ہم مسلمان، مسیحی دنیا کے سامنے خود کو اچھا اور امن پسند ثابت کرنے کے لیے نفسیاتی دباؤ کا شکار ہیں!

یہ رویہ غلط، بے جا اور بے سود ہے!

جب تک ہم متحد اور طاقتور نہیں ہو جاتے، کوئی بھی ہماری بات پر کان نہیں دھرے گا۔ یہی وہ طریقہ ہے جس کے ذریعے یہودی جو قتل عام اور ہولوکاسٹ کا شکار ہوئے، آج وہی یہودی عیسائیوں کے لیے قابل عزت بنے ہوئے ہیں۔

عزیز دوستو!

تاریخی تناظر میں عظیم تہذیبوں کو مندرجہ ذیل بنیادوں پر پرکھنا چاہیے:

۱۔ ان کے نظریہ یعنی مقدس کتب کی بنیاد پر؛

۲۔ اور ان کے دستور العمل یعنی مقدس (کتاب) کے حکومت میں اطلاق کی بنیاد پر۔

نظریہ اور دستور العمل کی روشنی میں اسلام اور مسیحیت میں عظیم فرق یہ ہے کہ مسیحیت ایک ''تجرد پسند'' (Exclusive) تہذیب کی حامل ہے، جبکہ اسلام ایک ''جامع'' (Inclusive) تہذیب رکھتا ہے۔

میثاق مدینہ اور بنی امیہ سے لے کر عثمانیوں کے نظام ملت تک ہم مسلمان ''بقائے باہمی میں اتفاق ویگانگت'' کے فن سے واقف ہیں۔

ہم نے جن لوگوں پر حکومت کی، ہم نے انھیں ان کے اپنے طریقے سے جینے کی اجازت

دی۔اسلاموفوبیا(Islamophobia) عام فہم الفاظ میں امتیازی فلسفہ حیات کے مغربی ورثہ کا نتیجہ ہے۔اس لیے بجائے اس کے کہ ہم عذر خواہی کریں، یہ مغربی تہذیب کا فرض بنتا ہے کہ وہ ہم پر یہ بات ثابت کریں کہ ان کا فلسفہ (حیات) جامع اور رواداری پر مبنی ہے۔جیسا کہ ہم چودہ صدیوں سے اذان کے ساتھ کلیسا کی گھنٹیوں کی آوازیں سنتے آئے ہیں تو اکیسویں صدی میں یہ اجنبی بات کیوں سمجھی جائے کہ یورپ کے لوگ کلیسا کی گھنٹیوں کے ساتھ اذان کی آواز سنیں۔

یہودیوں کے قتل عام (ہولوکاسٹ) کی شرمندگی کی بنا پر، یورپ نے دوسرے ممالک سے آئے ہوئے مزدوروں کیساتھ ''بقائے باہمی'' کی کوشش کی، جو ان کے درمیان ''غیر'' (Others) تھے،لیکن یورپ ناکام ہوگیا اور صرف پچاس برس میں ہی اس نے (بقائے باہمی کے حوالے سے) شکست تسلیم کرلی۔

جیسے ہی معاشی مشکلات کا آغاز ہوا، یورپ نے دوسرے ممالک سے آئے ہوئے مزدوروں کو اپنے اندر ضم کرنے کی کوشش کی، مزید برآں، آمدنی کی تقسیم کی ابتر صورت حال کے ساتھ ساتھ نسل پرستی اور مسیحی انتہا پسندی بھی نہ صرف یورپ بلکہ امریکہ میں تیزی کیساتھ نمودار ہورہی ہے۔آج مسلمان بھی یورپ میں بالکل ایسے ہی ہولوکاسٹ کے روبرو ہیں جیسے یہودیوں نے بیسویں صدی میں اس کا سامنا کیا تھا۔

عزیز دوستو!

یہ بات ہم سے پوشیدہ نہیں ہے کہ جب کلیسا نے رومی سلطنت پر قبضہ کیا تو اس کے نتیجہ میں یورپ ہزار سالہ تاریک دور (Dark age) میں ڈوب گیا۔یورپ اپنی نشاۃ ثانیہ کے ساتھ ہی مذہب کی ریاست سے عملداری ختم کرکے آزاد ہوگیا۔تاہم، ردعمل کے مبالغے کے نتیجے میں، جدیدیت نے زندگی کے سب سے اہم پہلو یعنی روحانی توازن کو کھو دیا۔جدیدیت نے مسیحی روح میں ایک منقسم شناخت (Split identity) پیدا کردی۔

جہاں تک اسلام کا تعلق ہے تو اس کی تاریخ میں قرآن نے (امت کی) سالمیت اور کُلّیت (Integrity) کے ساتھ روحانی اور دنیاوی احتیاجات میں توازن پیدا کرنے کا کردار ادا کیا ہے، اور اسی لیے اسلامی تاریخ میں کسی ''تاریک دور'' یا مذہبی ''تفتیشی عدالت'' (Inquisition) کا وجود نہیں ہے۔ متقی اور پرہیزگار مسلمان آج بھی (دین اور دنیا کے امتزاج پر مبنی) ایک کلی (Holistic) روح کے حامل ہیں۔

عزیز دوستو!

جب انتہا پسند عیسائی ـــــ جمہوریت، انسانی حقوق، غلامی، جنگ اور حقوق نسواں جیسے مسائل کے حوالے سے قرآن کو ہدف تنقید بناتے ہیں، تو عین اسی حالت میں وہ ان موضوعات سے متعلق بائبل کی اساسی نوعیت کی آیات کو چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ بات کتنی دل سوز ہے کہ کتنے ہی امریکی، یورپی، افریقی اور مشرق بعید سے تعلق رکھنے والے افراد ہیں جو اسلام کا بطور مذہب انتخاب کرنا چاہتے ہیں، لیکن خود پر دہشت گرد ہونے کی چھاپ لگنے سے ڈرتے ہیں۔ مشرق بعید اور افریقی لوگ بالخصوص اپنی روحانی جستجو میں، محض نفسیاتی دباؤ کے سبب اسلام کے بجائے عیسائیت کو منتخب کرتے ہیں۔

میں نے ''کنگ جیمز بائبل'' (King James Bible) اور سٹیو ویلز (Steve Wells) کی The Skeptic's Annotated Bible کا خاص طور پر ایک تقابلی مطالعہ کیا تھا۔ اس مطالعہ سے میرے علم میں یہ بات آئی کہ عہد نامہ قدیم کی بیشتر آیات کو اگر استعمال کیا جائے تو وہ آج بھی تفریق و امتیاز، جنگ، انسداد انسانی حقوق، اور خوف ودہشت کے لیے بالکل ایسے ہی مدد ومعاون ثابت ہو سکتی ہیں جیسے وہ تفتیشی عدالتوں اور صلیبی جنگوں کے دوران کارآمد ثابت ہوئی تھیں۔

لہٰذا، جب مذکورہ بالا عنوانات کے تحت ہماری مقدس کتاب پر حملہ کیا جائے تو اس الزام کی تردید کی خاطر ہمیں معذرت خواہانہ اور مدافعانہ رویہ اختیار کرنے کے بجائے پیش قدمی کرنی چاہیے۔

نسلی، لسانی اور مذہبی فرقہ بندی کی بنیاد پر ایک قومی ریاست کا تصور ایک متوازی نقطۂ نظر ہوگا۔ اگر ہم انقلاب فرانس کو جدید قومی ریاست کا نقطہ آغاز مان لیں تو اس نوزائیدہ تصور نے عمیق انسانی تاریخ میں تخمیناً دو سو برس کی آزمائش طے کی ہے۔

آج قومی ریاست دو اطراف سے مرکز گریز (Centrifugal) قوتوں کے حملے کی زد میں ہے، زیریں سطح پر جدید قبائلی مائیکرو قوم پرستی اور بالائی سطح پر یورپی یونین کی طرز پر جدید عالمی سلطنت کی تشکیلات (Formations) کی جانب سے حملہ جاری ہے۔

جہاں تک مسلم دنیا کا تعلق ہے تو یہاں قومی ریاست کا مطلب نسل پرستی کی حتمی شکل ہے، اور یہ تصور مسلم روح سے غایت درجہ ناموافق ہے، جس کا مطلب مومنین میں مصنوعی سرحدوں کی بنا پر تفریق پیدا کرنا ہے۔ جیسا کہ ہمارا آج کا موضوع، ''مسلم دنیا میں کثیر الجہتی تحفظ کی تعمیر کرنا ہے''، میرے نزدیک یہ جکڑ بندی (Straightjacket) عصر حاضر میں امت مسلمہ میں پائے جانے والے اختلافات کے بنیادی اسباب میں سے ایک ہے۔

جب تک ہم نسل پرستی کے وائرس کو مسلم اشرافیہ کے تحت الشعور (Subconscious) سے کھرچ نہ ڈالیں گے اور اہل علم (نسل پرستی کی) اس بات کو فراموش نہ کر دیں، اور اسلام کی وحدت پسند اور کلّی جذبہ کی جانب واپس نہ مڑ جائیں تو اس بات کا خطرہ موجود ہے کہ مسلم سماج عنقریب سیکڑوں متحارب گروہوں میں تقسیم ہو کر امت پر بدبختی کی بوچھاڑ کا سبب بن سکتا ہے۔

میرا یہ سب کچھ عرض کرنے کا مقصد یہ نہیں ہے کہ ہم (یعنی امت مسلمہ) پر عائد کردہ سرحدوں کی بالجبر تنسیخ کر دی جائے، بلکہ میرا مدعا ہے کہ امت مسلمہ کے روحانی بھائی چارے کے کلّی جذبہ کی ترکیب و امتزاج (Synthesizing) کی طرف مراجعت کی جائے۔

عزیز دوستو!

تشدد اور انتہا پسندی کی تحقیق کرتے وقت، سب سے پہلی چیز جو زیر بحث لانی چاہیے وہ

انتہا پسند شخص کا محرک اور اس کی ذہنیت ہے۔ یہ بات ممکن ہے کہ وہ ایک جاہل شخص ہو اور اس کی تربیت بھی جہلاء نے کی ہو۔ یا یہ بھی ممکن ہے کہ وہ متجدد تعلیم کا پیدا کردہ ایک تجزیہ نگار اور فلسفی ہو۔ یہ دونوں قسم کے اشخاص جہاد کے بجائے مفاد پر مبنی سیاسی جنگوں کی جانب راہنمائی کرتے ہیں۔

امت کا شریعت اور لادینی احتیاجات کے مابین پنڈولم بننے کا سوال مسلمان ذہن میں عقلی بے چینی پیدا کرنے کا سبب بنتا ہے، اس اہم سوال کو تجدد (Modernity) نے حکومت میں بالجبر ٹھونسا ہے۔ ہمارے آباؤ اجداد نے اس دہری مشکل کا کیا حل نکالا تھا؟

سلطنت عثمانیہ سے اس بارے میں ایک مثال پیش کی جاسکتی ہے جہاں نجی قانون کی بنیاد کاملاً شریعت پر تھی، (غیر مسلموں کو یہ حق دیا گیا تھا کہ وہ اپنے نجی معاملات کا فیصلہ اپنے مذہبی علماء اور اپنی مذہبی کتاب کے مطابق کر سکتے تھے۔) حکومت کا نظام عرفی قانون پر مبنی تھا جو کہ شریعت کے خلاف نہیں ہونا چاہیے تھا۔

عصر حاضر میں، ہمارے اذہان میں موجود جدید منطق پر مشتمل دہری مشکل یہ ہے کہ شریعت اور دنیاوی ضروریات و احتیاجات کہاں ایک ہو جاتی ہیں۔ نیز یہ کہ عالمی بستی میں غیر مسلموں کے ساتھ ہمارے تعلقات میں شریعت کا کیا مقام ہے۔ اسلامی دنیا میں اس دہری مشکل کو حل کیے بغیر عقلی اذیت جلد ہمارا پیچھا چھوڑنے والی نہیں ہے۔

تصور جہاد بھی اس حوالے سے ایک نازک مقام کا حامل ہے۔

بیسویں صدی تصورات اور نظریات کی موت کا زمانہ تھا، بالخصوص سویت یونین کے زوال و انحطاط کے بعد اسلام ہی مظلوموں اور مجبوروں کے لیے وہ واحد مذہب رہ گیا جسے مادہ پرستی کے لیے استعمال کیا جائے، اور یہ (مادہ پرستی) مفادات کا ایک تند و تیز نظریہ ہے۔

ہمارے سامنے سوال یہ ہے کہ ہم اپنے مقدس مذہب کو مادہ پرستی کے ظالم و سفاک نظریے کے ہاتھوں اغوا ہونے سے کیسے بچائیں؟

اگر ہم اس کا کوئی حل تلاش نہیں کرتے تو ہمارا ''شہادت'' کا مقدس تصور اور اپنی آبائی سرزمینوں کو دشمنوں کے حملے سے بچانے کے لیے حتمی قربانی کا تصور ماند پڑ جائے گا، حتیٰ کہ ہماری افواج جو ہمارے ممالک کی حفاظت کر رہی ہیں، ان کے سر بھی دہشت گرد ہونے کا الزام تھوپ دیا جائے گا۔

جہاں تک بین الاقوامی تعلقات کی بات ہے تو مسلمانوں کی غیر مسلموں کے ساتھ یگانگت پر مشتمل بقائے باہمی کے ہزار سالہ تجربہ کی خاطر ہم میثاق مدینہ کا حوالہ دے سکتے ہیں، اس کے ساتھ ہی رومی تجارتی بازار (Agora) کا استعارہ بھی استعمال کیا جاسکتا ہے، جہاں تمام مذاہب اور نسلوں کے افراد آپس میں تجارتی اور ثقافتی سرگرمیوں کے لیے ملتے جلتے تھے، اور اس میل ملاپ کے نتیجہ میں واپس جا کر اپنے دیہاتوں اور قصبوں کو اس (تجارتی اور ثقافتی سرگرمی) سے منور کرتے تھے۔

نئی عالمی بستی میں یہ انسانوں کے حقیقت پسندانہ تعلقات کا تقاضا ہے کہ تمام انسان اپنی شناخت کو برقرار رکھتے ہوئے اور دوسروں کی شناخت کا احترام ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے، اپنی ضروریات کا تبادلہ کرنے کے لیے ایک دوسرے سے پُرامن طریقہ سے میل ملاقات کریں۔

مسلم دنیا میں سکیورٹی، حکومت اور جمہوریت کے حوالہ سے ہمیں اپنے حکمرانوں کی ازحد مغربیت زدہ ذہنیت اور ان کی اپنے عوام سے بیگانگی کے بارے میں محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ مقتدر اشرافیہ اپنے لوگوں کو ظلم و تعدی کا نشانہ بناتی ہے اور اپنے لوگوں کے مفاد کے لیے کام کرنے کے بجائے محض چند عالمی فیصلہ سازوں کے ساتھ تعاون کرتے ہوئے، اپنے عوام کو ایک موقع بھی نہیں دیتی کہ وہ جمہوری انداز میں اپنا غبار نکال لیں۔

اس بات نے عالمی بستی کو ایک پریشر ککر کی مانند بنا دیا ہے، جو کسی لمحہ پوری دنیا میں آتش فشاں پہاڑوں کی طرح پھٹ پڑے۔ یہ گوریلا اور دہشت پر مبنی جنگ و جدل کی بنیادی وجہ ہے۔ یہ سبب نہ صرف مسلمانوں بلکہ کم و بیش یورپ کے بے روزگار عوام کے لیے بھی کارفرما ہے۔ اکیسویں صدی عدم

استحکام کی ایک تاریک تصویر پیش کرتی ہے۔

عزیز دوستو!

مسلم ممالک میں تعلیم ایک بے مقصد بہاؤ کی طرح ہے۔ ہمارے چند ممالک میں یہ غایت درجہ مادہ پرستی کا شکار ہے۔ اور چند ممالک میں تعلیم کے شعبہ میں دنیا کے فنی سائنسی علوم کو نظر انداز کر دیا گیا ہے، اور وہاں تعلیم کے شعبہ میں مکمل طور پر روحانی پہلو حاوی ہے۔

ایسی تعلیم جو روحانی اور مادی ضروریات میں توازن قائم کرے ایک محفوظ اور خوشحال امت کے لیے ایک قطعی بنیاد بن سکتی ہے۔ تاہم عصر حاضر میں ہم مادہ پرستی کی انتہا سے خالص روحانیت کی انتہا تک زقند بھر رہے ہیں۔

اگر میں ترکی کی ایک مزاحیہ مثال پیش کروں، جہاں کمالی (Kemalist) نظریہ ہی تمام تعلیمی نصاب پر حاوی ہے، اس لیے جب ترکی میں غیر ملکی سرمایہ کار فنی و تکنیکی افراد کی درخواست کرتے ہیں تو ہم انھیں کہہ سکتے ہیں کہ ہماری پاس کافی تعداد میں تکنیکی اسکول نہیں ہیں، لیکن ہم انھیں ایک اچھا کمالی مہیا کر سکتے ہیں جو پیچیدہ الیکٹرانک کا کام کر سکتا ہے۔ کسی اور مسلم ملک کی طرف سے ایک دوسرا مزاح پیش کیا جا سکتا ہے، جہاں وہ ایسی ہی صورت حال میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ اچھے پیش امام مہیا کر سکتے ہیں جو تکنیکی کام کر سکتے ہیں چونکہ ان کے ملک میں بھی کافی تعداد میں تکنیکی اسکول موجود نہیں ہیں۔

یہ قدیم، (مذہبی) عقیدہ پر مبنی تعلیمی نصاب ہیں، جو اوائل بیسویں صدی کے دیہاتی لوگوں کے لیے بنائے گئے تھے، اور یہی وہ نصاب ہیں جو اکیسویں صدی کی انفارمیشن ٹیکنالوجی کے دور میں ہمیں تخلیق و ایجاد اور مادی طاقت میں پیچھے رکھے ہوئے ہیں۔

جہاں تک روحانی تعلیم کا تعلق ہے تو ہماری زیادہ تر مذہبی تعلیم بدترین حالات میں تشکیل دی گئی ہے، ہمارے (مذہبی) اساتذہ اور پیش امام اوسطاً سیکنڈری اسکول سے کم درجہ کی تعلیم کے حامل ہوتے ہیں اور ہمارے جہلاء ''الحق'' (absolute truth) پر اجارہ داری کا دعویٰ کر رہے ہوتے ہیں۔ جبکہ

عیسائی دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ مبلغین اور مذہبی اساتذہ ایم اے اور پی ایچ ڈی کی ڈگریوں کے حامل ہوتے ہیں۔ جب تک ہم اس مقصد کو اہمیت نہیں دیتے، ہماری نوجوان نسلیں زندگی میں توازن نہیں پا سکتیں؛ دریں صورت وہ یا تو انتہا پسند بن جائیں گی یا ہمارے مقدس مذہب سے بیگانہ ہو جائیں گی۔

اپنی تقریر کے تقریباً اختتام پر، میں ایک دلچسپ علمی نقطۂ نظر کو چھیڑنا چاہوں گا، جو مجھے اپنے قدیم مطالعہ میں سے یاد ہے، جو (نقطۂ نظر) یہ دعویٰ کرتا ہے کہ یورپ ایشیا سے اس لیے آگے نکل گیا کیونکہ ناہموار یورپی خطے نے لوگوں کو تقسیم کر دیا تھا اور وہ مستقل طور پر باہم نبرد آزما رہتے تھے؛ سرگرمی اور مسابقت نے انھیں تمام میدانوں میں آگے بڑھنے کی طرف راہنمائی کی۔ جبکہ ایشیا کی بڑی سلطنتوں کی ترجیح استحکام تھی، وہ اس استحکام کو تہہ و بالا کرنے کے ہرگز روادار نہ تھے، اور وہ گہری غنودگی میں پڑے ہوئے تھے۔

آج ہمارے زمانہ میں، یہ عمل الٹ ہو گیا ہے یعنی یورپی یونین استحکام کی خواہاں ہے۔ مسلم سماج مستقل طور پر جنگ، مسابقت اور رقابت کی حالت میں ہیں۔ یہ حالت ہمارے مفکرین کے دماغوں کو ہمارے پیچیدہ مسائل کی اختراعی عقدہ کشائی پر مائل کر سکتی ہے۔ یہ ہماری فکر گاہوں (تھنک ٹینکس) کے لیے ایک اہم محرّک ہے۔

لہٰذا ہم اختتامی الفاظ کی طرف آتے ہیں جو فکر گاہوں اور تزویری مطالعہ سے متعلق ہیں۔ جیسا کہ جدید مغربی طرز حکومت اور کاروبار تزویری مطالعہ، طویل المیعاد نظریات اور سائنسی منصوبہ بندی پر بھروسہ کرتے ہیں، جبکہ ہمارے کام کاج کے طور طریقوں کا دارومدار فیصلہ ساز کی وقتی نفسیاتی کیفیت پر موقوف ہوتا ہے۔ یہ ہمارے ممالک میں حکومت میں ناکامی کی ایک اہم وجہ ہے۔

آپ کے تعاون کا شکریہ!

(ترجمہ: محمد علی ظفر)

Source: http//tasam.org/en/lcerik/17480/muslims-should-lie-apologetic